

دو مذہبی نظام ہائے فکر

تقلید کے اور تخلیق کے

☆═══════════△═══════════الطاف جاوید

تیسری خصوصیت - زمان کی تخلیقی حرکت کا انکار

وقت کی تخلیقی حرکت کا مفہوم زمانِ خالص کا اپنے آپ کو زمانِ تسلسل میں تبدیل کرتے رہنا ہے۔ اس تبدیلی سے مظاہر وجود کے ان گنت جدید سے جدید تر سلسلوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور یوں ازل سے کائنات اپنی اتناہی سے تمامیت کی طرف قدم بڑھاتی چلی جا رہی ہے یعنی وقت کی تخلیقی حرکت کا سخی یہ ہے کہ تاریخ اپنے عمل میں ارتقار پذیر ہے۔ وہ ایک دور سے دوسرے دور میں اور دوسرے سے تیسرے دور میں قدم رکھتی ہے اور ہر دور اپنے ماقبل دور سے زیادہ وسیع، زیادہ پُر مایہ اور زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ ایک دور گزشتہ دور سے اپنے احکام و مسائل، اپنی ماہیت و کیفیت اور ہیئت و مافیہ میں قطعاً مختلف ہوتا ہے۔

تاریخ کی حرکت اپنی نوعیت میں چوں کہ تخلیقی ہے، لہذا ترقی پسند ہے جو حرکت کے میکائیکی تصور کی ضد ہے۔ میکائیکی تصور میں حرکت تو پائی جاتی ہے مگر یہ حرکت صرف ایک ہی دائرہ میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس دائرہ سے وسیع تر دائرہ میں قدم نہیں رکھتی۔

تاریخ اور زمان کے تخلیقی تصور سے ماضی پرستی اور قدامت پسندی کے لئے کوئی جواز نہیں ملتا۔ ماضی کا احترام صرف اس معنی میں ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ ملت کے فکری و عمرانی وجود کی نمو پذیری اور بالیدگی میں ایک تسلسل قائم رہے، مگر ماضی کے احترام کا یہ مفہوم قطعاً نہیں لیا جاسکتا کہ مستقبل کے جدید عناصر کو نظر انداز کر کے حیاتِ مٹی کی نمو پذیری کے عمل کو روک دیا جائے۔

مذہبی تقلیدی نظام میں ازل تو حرکت و تغیر کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اگر اسے گوارا کر بھی لیا جائے تو

اُس کے صرف میکانیکی تصور کو اپنایا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس نظام کی نظر میں کائنات کوئی اضافہ پذیر وجود نہیں بلکہ "الآن کما کان" کے مترادف ہے۔ لہذا اس کے نزدیک وہ تمام معاشرتی ادارے جو نزولِ قرآن کے وقت میں موجود تھے، اپنی ہیئت و ترکیب میں ناقابلِ تغیر و اضافہ ہیں۔ فطرت کا ترقی پسند عمل ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اور ان اداروں کے متعلق جو احکام و قوانین وضع ہو چکے ہیں، میکانیکی طور پر ان کی تقلید ہی منشاءِ الہی ہے۔

مگر اس تصور کے برعکس انسانی معاشرہ آج جس تخلیقی و ارتقائی مرحلہ پر پہنچ چکا ہے، اس مرحلہ میں غلامی کا ادارہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ لہذا قرآن و احادیث کے وہ احکام و مسائل جو غلامی اور غلامانہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں، اس عہد کا مسلمان ان پر عمل پیرا ہونے سے قاصر ہے۔

قرآن حکیم نے عورت پر مرد کی قوامیت کے دو وجوہ بتائے ہیں۔ ایک تو جسمانی فضیلت اور دوسرے یہ کہ مرد اپنا مال عورت کے نان و نفقہ پر خرچ کرتا ہے۔ لیکن ہمارے عہد کے معاشرہ میں یہ دوسری وجہ قوامیت روز بروز کمزور پڑتی چلی جا رہی ہے۔ عورت بسرعت تمام معاشرہ کے ہر شعبہ میں مرد کے دوش بدوش آتی جا رہی ہے۔ عورت کے اس ترقی پسند عمل کو محض مغرب کی سازش نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ یہ تاریخ کا تخلیقی عمل ہے اور اس عمل سے عورت کی معاشرتی حیثیت، عاملی نظام کی ترکیب و تنظیم اور پردہ کے حدود کے تعین وغیرہ تمام مسائل میں تبدیلی کا لازمی ہو چکا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے مگر میکانیکی طور پر نہیں بلکہ تخلیقی لحاظ سے۔ اس لئے وقت کے پہیے کو ماضی کی طرف موڑ دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

ایک ایسے مسلمان کے لئے جو قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق حق تعالیٰ کی مشنوں کو متجددہ کے عمل کا قائل ہے۔ ان مذکورہ مثالوں سے قرآنی تعلیمات کی ابدیت کے متعلق پیدا ہونے والے اشکال سے بے یقینی کے مرض میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ قرآن حکیم حیاتِ انسانی کو اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے، حسنِ کامل، حریتِ مطلقہ اور تقدیس کی جس ارفع منزل تک پہنچانا چاہتا ہے، یہ تمام احکام اُس غایت کی طرف جانے والے راستہ کی مختلف منازل ہیں۔ یہ بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ حیاتِ انسانی کو ان کی مدد سے اپنا ارتقائی سفر آسانی سے جاری رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ کوئی فرد یا افراد کا کوئی اجتماع قرآن حکیم کے ان احکام کو اپنی مرضی سے معطل نہیں کر سکتا اور نہ ان میں کسی طرح کا تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ معاشرہ اپنے ارتقائی عمل میں جتنا آگے بڑھتا جائے گا، احکام قرآنی میں خود بخود ایک تخلیقی و ارتقائی تبدیلی رونما ہوتی جائے گی۔ ہر عہد کے مسلم ذہن کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا بخور و مطالعہ کرتا ہے۔ اور ان کی منشا کے مطابق اپنے اجتماعی اور انفرادی وجود میں مناسب تبدیلیاں کرتا رہے۔

قرآنی احکام کے اس طرح تبدیل ہونے سے یہ سمجھ لینا بھی غلط ہو گا کہ اب یہ قطعاً بے کار ہو چکے ہیں اور اپنی عمرانی افادیت کو بالکل کھو چکے ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہر حکم اپنے اندر ایک منشا رکھتا ہے اور یہ منشا زمان و مکان کی پابندیوں سے ماوراء ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلعم کے عہد مبارک میں جب معاشرہ انسانی اپنے ارتقائی عمل میں غلامی سے جاگیرداری مرحلہ میں قدم رکھ رہا تھا، احکام قرآنی کے منشا نے اپنے آپ کو اُس عہد کے مخصوص معاشرتی تقاضوں کے مطابق ایک مخصوص ہیئت و شرائط کے ماتحت ظاہر کیا تھا۔ اور آج جب کہ وہ عہد بدل چکا ہے، معاشرہ جاگیرداری مرحلہ سے ترقی کر کے نہ صرف سرمایہ داری بلکہ صنعتی مرحلہ تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس نئے مرحلہ کے منطقی تقاضوں کے مطابق ایک نئی صنعتی ہیئت و شرائط وجود پذیر ہو رہی ہے تو احکام قرآنی میں اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو ان کی اُس ہیئت و شرائط میں جسے جاگیرداری عہد نے جنم دیا تھا۔

صنعتی عہد سے پہلے کے معاشروں میں پس ماندہ طبقہ صرف غلاموں کا طبقہ تھا۔ لہذا قرآن و احادیث میں غلامی سے متعلق جتنے بھی احکام ہیں، ان سب کا منشا یہ تھا کہ اُس عہد کے پس ماندہ طبقات، غلام، محروم، مسکین اور یتیم وغیرہ کو انسانی حقوق دے کر انہیں ترقی و خوش حالی کی شاہ راہ پر ڈال دیا جائے تاکہ وہ معاشرتی ارتقار کے ساتھ آسانی سے قدم اٹھا سکیں۔ یہ منشا چوں کہ ماوراء مکان و زمان ہے، اس لئے آج بھی وہ اپنے مفہوم و معانی کے ساتھ قائم و دائم ہے اور ہم اپنے عہد کے پس ماندہ طبقات کے لئے، جو اُجرتی کسان اور صنعتی محنت کش عوام پر مشتمل ہیں اور جنہیں ازمنہ و سطلی کے ذریعے غلام کے مقابلہ میں اُجرتی غلام کا نام دیا جاسکتا ہے، اس منشا کو قرونِ اولیٰ کی طرح ان اُجرتی غلاموں کی ترقی و خوش حالی کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ عہد کے اختلاف کی وجہ سے ہیئت و شرائط مختلف ہوں گے، جن کے ذریعے یہ منشا اپنے تقاضوں کو پورا کرے گا۔

اپنے پہلے دور میں اسلام نے عورت کو خاوند اور باپ سے مہر اور جہیز دلا کر اُسے محنت کرنے اور اُس محنت کے معاوضہ کا مالک تصور کر کے، درشتہ میں اُسے قابلِ قدر حصہ وصول کرنے کا مستحق قرار دے کر، خاوند کے انتخاب میں اُس کی مرضی کو شامل کر کے اور اُسے خلع و طلاق کے حقوق دے کر اُس کے معاشرتی مرتبہ کو جس طرح بلند کیا تھا، یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ اس عہد کے معاشرہ نے ان حقوق میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے جو حریت و مساوات نسواں کے قرآنی منشاء کے عین مطابق ہیں، بلکہ اس منشاء کے مافیہ میں پہلے سے ہی شامل ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اُس عہد میں عورت اور مرد کے سماجی میل جول اور اختلاط کے مواقع نہیں تھے۔ اس بنا پر مرد اور عورت کی علیحدگی کا جو تصور ابھرا تھا، آج کے عہد میں اُس کا اپنی قدیم شکل میں قائم رہنا ناممکن ہے، مگر جنسی آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کا علاج یہ سوچا جاتا ہے کہ عورت اور مرد کی مکمل علیحدگی کو عمل میں لایا جائے۔ یہ علاج نہ صرف اس عہد کے جدید تقاضوں کے خلاف ہے بلکہ ادھورا اور منفی بھی ہے۔ صحیح اور مثبت علاج یہ ہے کہ تعلیمی نظام کے ذریعہ عورت اور مرد کے شعور کو بدلا جائے، انہیں ایک دوسرے کے فطری مقام سے آگاہ کیا جائے۔ ایک دوسرے کی شخصیت کا احترام کرنا سکھایا جائے، تہرج جالبیہ کے معاشرتی اور اخلاقی نقصانات کے متعلق انہیں آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ جنسی بے راہ روی کا باعث مرد و عورت کا معاشرتی میل جول نہیں بلکہ اس کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب طبقاتی ناہمواری کی موجودگی اور صحت مند تصور حیات کا فقدان اور عورت کے فطری اور معاشرتی مرتبہ کے متعلق غلط شعور کا ہونا ہے۔ ہمارا مذہبی طبقہ یورپ کی معاشرتی خواہیوں اور جنسی بے راہ رویوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا عادی ہے مگر ان کے معاشرتی اسباب پر کبھی روشنی نہیں ڈالتا۔

اس مسئلہ سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق اور معاشرتی نظام کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اور کیا اخلاقی زوال معاشرتی نظام کے، جس کی اساس معاشی روابط پر مبنی ہوتی ہے، بگاڑ سے جنم لیتا ہے؟ کیا یہ دونوں ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم کے نظریہ تاریخ اور امام دلی اللہ کی تشریح و تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی زوال معاشرہ کے استحصال پسند اور استحصال پذیر طبقوں میں بٹ جانے سے وجود میں آتا ہے۔ جنسی آوارگی، تعیش پسندی، حیات کا بے غایت اور نصب العین

سے ماری تصور، انسان کے خدا، معاشرہ یا اپنے ضمیر کے سامنے مسؤل ہونے کے نظریہ کے فقدان جیسے تمام نظریات کو استحصال پسند طبقہ جنم دیتا ہے اور پھر ان خیالات و تصورات کا عکس منجملہ طبقوں پر پڑتا ہے۔

لہذا ہمارے مذہبی قائدین کا یہ سمجھ لینا کہ جنسی آواز کی محض عورت مرد کے عام میل جول سے پیدا ہوتی ہے، صحیح نہیں اور یہ بات نہ مغرب میں صحیح ہے نہ مشرق میں۔ مغرب ہو یا مشرق جنسی آوارگی اور اخلاقی تباہی نظام معیشت و معاشرت کی بنیادی خرابی کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کا علاج و عطف و نصائح اور مغربی ممالک میں ہونے والے جرائم کی فہرستیں مرتب کرنا نہیں ہے، بلکہ معاشرتی اور معاشی بگاڑ کو درست کرنا ہے۔

موجودہ عہد کی سائنسی تحقیقات اور خود قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ گناہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ انفرادی نہیں۔ شیطان ایک خارجی حقیقت بھی ہے، محض داخلی نہیں۔ معاشرتی شر ہمارے داخلی شیطان کے ساتھ تعلق قائم کر کے گناہ کو وجود میں لاتا ہے۔ لہذا گناہ سے اُس وقت تک نجات حاصل کرنا ناممکن ہے، جب تک اسلام کے عادلانہ معاشی نظام کے نفاذ، حیات کے غایتی تصور اور تہجیر جاہلیہ پر مناسب پابندیاں عائد نہ کی جائیں گی۔ اسلامی سوشلزم دراصل اسلام کی ایک تخلیقی تعبیر ہے۔ اور یہی تعبیر اس عہد میں ہمارے ہر مرض کی دوا ہے۔

زمین کو، جو ازمنہ وسطیٰ کے عہد میں پیداوار کا سب سے اہم ذریعہ تھی، نجی ملکیت قرار نہ دینا، فرد کی اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت اور جائیداد کا وارث اُس کے بڑے لڑکے کو قرار دینے کی بجائے اُس کے لواحقین اور رشتہ داروں کا حصہ مقرر کر دینا، سائل و محروم کے حق کو نہ کہ خیرات کو مال داروں کے سرمایہ میں قائم کرنا، دولت کو اغیار کے طبقہ تک محدود رکھنے کی ممانعت اور محنت کش کو اللہ کا دوست سمجھنا، یہ سب باتیں اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن حکیم کسی شکل میں بھی دولت کے اجتماع (کنز) کو ایک فرد یا چند افراد کے ہاتھوں میں مناسب نہیں سمجھتا اور اگر کہیں ایسا واقعہ ظہور میں آجائے تو فوراً اُسے تقسیم کر دینے کی تدبیر اختیار کرتا ہے۔

قرآنی احکام کے نفاذ دراصل اُس کی سرمدی حکمت کا ایک حصہ ہیں، جو نسل انسانی کے اس کرۂ ارض پر باقی رہنے تک معاشرہ کے ارتقائی عمل کے لئے ہر مرحلہ پر روشنی مہیا کرتے رہیں گے

اور اس طرح معاشرتی حرکت کے اپنے نصب العین اور نغایت تک رسائی حاصل کرنے میں راستہ سے بھٹک جانے کے خوف کا انزالہ ہوتا رہے گا۔

نذہبی تقلیدی نظام کی اساس چوں کہ منطق قیاسی پر ہے، جو مابعد الطبیعیات کی فکری منہاج ہے۔ اس لئے اس نظام فکر میں مسائل حیات کے متعلق ”یا تو الف ہے یا پھر کچھ نہیں“ کی اصطلاحوں میں سوچا جاتا ہے۔ یعنی اگر الف ہے تو ب نہیں ہو سکتا۔ الف اور ب کے درمیان کوئی رشتہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے نزدیک الف کا ایک ہی وقت میں الف ہونے کے ساتھ ب یا کچھ اور ہونا ناممکن ہے۔ کیوں کہ ہر شے یا اصول کے اوصاف اور خاصیتیں متعین ہوتی ہیں۔ اُن میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ لہذا ایک شے ایک وقت میں وہی ہو سکتی ہے جو وہ ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہ اصول اس لئے وضع ہوا کہ منطق قیاسی اشیاء اور واقعات کا وقت کے بہاؤ میں واقع ہونا تسلیم نہیں کرتی۔ کسی واقعہ یا شے کی حقیقت معلوم کرتے ہوئے یہ وقت کی مقدار اس میں جمع نہیں کرتی۔

منطق قیاسی کے اسی قاعدہ کی رُو سے قرآنی احکام کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور اسی اصول کے مطابق نتائج بھی نکالے جاتے ہیں۔ یعنی غلامی سے متعلق احکام پر یا تو غلامانہ معاشرہ میں عمل کیا جاسکتا ہے، ورنہ کسی دوسرے نظام حیات کے حامل معاشرہ میں ان کو عمل میں نہیں لایا جاسکتا، کیوں کہ غلامانہ معاشرہ اپنے بنیادی خدوخال میں موجودہ سرمایہ دار یا اشتراکی معاشرہ سے مختلف ہے۔ حالانکہ تینوں معاشروں میں وصف مشترک ایک انتہائی پس ماندہ طبقہ کی موجودگی ہے، جو غلامانہ سماج میں جسمانی غلام، جاگیر داری سماج میں زرعی غلام اور صنعتی معاشرہ میں اُجرتی غلام (پروڈتاریہ) کہلاتا ہے، اور جس کی اصلاح و ترقی ان میں سے ہر نظام حیات میں مقصود تھی اور اب تک ہے۔ مگر تینوں معاشروں میں اس پس ماندہ طبقہ کی معاشرتی حیثیت میں فرق آجانے کی وجہ سے، ان کی ترقی و اصلاح کے لئے منہاج عمل بھی تینوں کے لئے مختلف ہو گیا ہے۔

قرآن حکیم کے ہر حکم کا ایک منشار ہوتا ہے اور حیات معاشرہ کے ارتقائی سفر میں ہر منزل پر اس منشار کی روشنی اور ہدایت کے مطابق ہم نہ صرف قرآنی مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں بلکہ قرآن حکیم کو ایک زندہ اور لافانی کتاب کی حیثیت سے اپنی نوخیز نسل اور دنیا کے سامنے پیش کرنے

کے قابل بھی ہو جاتے ہیں۔

لہذا منطق قیاسی کے اس مذکورہ قانون پر اگر جدلیاتی نقطہ نظر سے تنقید نہ کی جاتی تو احکام قرآنی کے معتد بہ حصہ کو اس عہد میں متروک قرار دینا پڑتا، اور اس طرح حیاتِ ملی کی نظری اساس میں ایک عظیم انتشار اور بے مرکزیت پیدا ہو جاتی جس کا نتیجہ تباہی و شکست کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اگر ہم قرآنی احکام کے منشار کے تصور کو نہ اپنائیں تو پھر ناسخ و منسوخ کے مسئلہ کو ایک واقعی حیثیت سے قبول کرنا پڑے گا اور اس طرح ہمارے فکر میں جو انتشار پیدا ہو گا اور قرآن حکیم کی صحت و جامعیت کے متعلق جو شکوک جنم لیں گے، اُن کا بالآخر نتیجہ زمانِ مستقبل کے ہر نئے مرحلہ میں اسلام کے ایک قابلِ عمل اور قابلِ فہم مذہب ہونے کی بجائے اُس کی وقتی حیثیت اور ایک مخصوص معاشرتی عہد کے ساتھ وابستگی کو تسلیم کر لینے کی شکل میں ظہور پذیر ہو گا۔ اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ رہتی دنیا تک کے لئے ایک دائمی اور جاوداں مذہب اور نظامِ فکر و عمل ہے، اپنی ساری افادیت اور صداقت کھودے گا۔ کیوں کہ عہد رفتہ کے معاشرتی اداروں میں واضح تبدیلیاں یا اُن میں سے کسی ادارہ کے وجود ہی کا خاتمہ اب معمولی ذہن والے آدمی کے لئے بھی کوئی رازِ سرستہ نہیں رہا۔ مگر ہمارا ایمان ہے کہ اسلام حیات کی تغیر پسندیوں سے شکست نہیں کھاتا بلکہ وہ جتنے بلند درجہ میں قدم رکھے گی، اسلام اُس کے مزید ارتقاء و تزکیہ کے لئے وہاں موجود ہو گا۔

پوچھتی خصوصیت - مذہبی گروہ بندی

قرآن حکیم نے یہودیت کی خصوصیات پر شدید تنقید کی ہے۔ ان میں جہاں عقیدہ پرستی، ہیئت و رسم پرستی اور ماضی پرستی شامل ہے، وہاں مذہبی گروہ بندی کو بھی خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔

مذہبی گروہ بندی کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب میں صداقت کے عنصر کو تسلیم نہ کرنا، اپنے مذہب کی عبادات و شعائر جن ظواہر و ارکان میں ادا کئے جاتے ہیں ان ظواہر کے علاوہ دوسرے ظواہر و ارکان میں ادا کئے جانے والی عبادت و شعائر کو نہ ماننا۔ جب تک اپنے مذہبی گروہ میں کوئی شامل نہ ہو جائے، چاہے وہ کتنا ہی نیک نفس اور پاک نحو ہو، اُس کی نیکی و پاک نفسی کو نجات کے لئے کافی نہ سمجھنا۔

مذہبی گروہ بندی اور اس کی مذکورہ خصوصیات کو اپنانے کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب ایک تخلیقی نامیاتی تحریک نہیں رہتا، جو معاشرتی ارتقار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی، اس پر اثر انداز ہوتی اور اُس کے اثر کو قبول کرتی ہے۔ آج عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور ہند مت کی الگ الگ ٹولیاں قائم ہو چکی ہیں، جو معاشرتی ارتقا سے قطعاً علیحدہ اپنے روم و صوبہ پرستی کے گھروندوں میں بند ہو کر اپنی حیاتِ مردہ کے دن پورے کر رہی ہیں۔ کیا مسلمان اس کی اجازت دیں گے کہ انہیں مذہبی ٹولیوں میں الٹا اشارہ اللہ ایک ٹولی اسلام کے نام پر بھی بنا دی جائے۔ جو اپنے گھروندے میں بیٹھ کر دوسرے مذاہب کی ٹولیوں کو ملاحیاں سناتی رہے۔

پانچویں خصوصیت - ثنویت پسندی

ثنویت پسند رویہ، حیاتِ انسانی کے ہر مسئلہ کو دو متقابل انتہاؤں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جن کے درمیان کوئی رابطہ یا رشتہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسے طرزِ متفکر کو ترویج دیتا ہے جو اشیاء اور ان کے رشتوں کو سمجھنے کے لئے، سب سے پہلے انہیں متقابل و متضاد گروہوں میں تقسیم کرتا اور پھر ایک دوسرے کی متخالف نسبت سے نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ تحقیق و تفہیم کا جدلی منہاج نہیں ہے، کیوں کہ جدلیات ایک ہی کُل میں متضاد قوتوں یا پہلوؤں کے اتحاد کو مانتی ہے۔ یہ تضاد شے کی فطری بناوٹ میں پایا جاتا ہے۔ اور شے کی حکمت کو قائم رکھتے ہوئے اپنا عمل کرتا ہے۔ ایک ہی کُل میں پائی جانے والی متضاد قوتوں کے عمل سے شے کی سالمیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، بلکہ یہ عمل ساری ارتقائی حرکت کا باعث بنتا ہے۔ اس عمل سے بریشے اپنی داخلی متضاد قوتوں کے متنازع عمل کے باعث اپنی پہلی ادنیٰ اور سادہ ساخت کو ختم کر کے اعلیٰ اور پے چیدہ تعمیری مراحل میں داخل ہوتی ہے۔

مگر جدلیات کے برعکس ثنویت ارتقائی حرکت کی مخالف ہے۔ ثنویت کے عمل سے ارتقا کے قدم رُک جاتے ہیں، کیوں کہ یہ ایک کُل کی داخلی متضاد قوتوں کا نام نہیں ہے بلکہ یہ خارجی متقابل قوتوں کی صفِ آرائی کا نام ہے۔ مثلاً ثنویت کی رُو سے حیوان اور انسان دو مخالف و متقابل قوتیں ہیں، جن کے درمیان کوئی رابطہ یا رشتہ نہیں ہے۔ یہ تاریخی ارتقار کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اپنی نشاۃِ اولیٰ سے ہی الگ الگ متضاد قسموں میں مٹی ہوئی ہیں۔ جب کہ جدلیات حیوان اور انسان کے درمیان

نامیاتی رشتہ کو تسلیم کرتی ہے۔

جدلیات وجود کی بنیادی قدر تغیر و حرکت کو مانتی ہے اور تغیر و حرکت کا مفہوم ہے نئی نئی اقدار کی تخلیق کا ہمدوم ہوتے رہنا۔ ہر شے یا تصور اپنی داخلی متضاد قوتوں کی باہمی کش مکش کی وجہ سے وقت کے سیلان میں ہمہ وقت تبدیل ہو رہا ہے۔ حیوان چون کہ تغیر و حرکت کے سیلان میں ہے اس لئے اس کی داخلی قوتوں کی باہمی کش مکش نے حیوانیت کی ادنیٰ اور سادہ سطح سے ارتقار پذیر ہو کر ایک نئی قدر انسانیت کو تخلیق کر لیا۔ جو حیوانیت سے اعلیٰ اور پے چیدہ ہے۔

چون کہ مذہبی تقلیدی نظام اپنی فطرت میں جدلیات کے برعکس ثنویت کا حامی ہوتا ہے۔ اس لئے یہ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رُخوں کو ایک کُل کے ماننے کی بجائے انہیں متخالف قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ لہذا پہلی تقسیم دین و دنیا کی اصطلاح میں کی جاتی ہے۔ یہ مذہبی تقلیدی نظام دین اور دنیا کی متضاد اصطلاحوں میں اپنے مفہوم کو بیان کرتا ہے، اُس کے نزدیک ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ و تعلق نہیں ہے۔ جو کام دینی ہو گا وہ دنیوی نہیں ہو سکتا اور دنیوی دینی نہیں۔ مگر اس کے برعکس یہ دونوں تصور ایک ہی کُل سے تعلق رکھتے ہیں یہ دونوں علیحدہ علیحدہ خانوں میں بٹے ہوئے نہیں ہیں۔ ہر وہ دنیوی یا معاشرتی کام جو انسان کے اندر نفسیاتی ارتقار پیدا کرے، وہ دینی ہے۔ کیوں کہ دین کا مقصد اور مفہوم انسان کی داخلی نفسیاتی حیات کو مسلسل طور پر ترقی دیتے رہنا ہے۔ یہ نفسیاتی تبدیل دراصل حیوانیت سے خالص انسانیت کی طرف قدم بڑھانا ہے۔

انسانیت، حیوانیت کے مقابلہ میں خالص فکری اور اجتماعی پسند زندگی کا نام ہے۔ امام ولی اللہ نے حیوان اور انسان کے درمیان تین چیزوں کو حد فاصل تسلیم کیا ہے۔ یعنی قوت ایجاد، رائے کلا اور ذوق جمال۔ دوسرے الفاظ میں تسخیر فطرت، تیر کلا اور حسن کامل کی تلاش اور ان کا حصول انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ اجتماعی اور انفرادی دونوں لحاظ سے ان اقدار ثلاثہ کو جتنا زیادہ جذب کیا جائے گا، اسی تناسب سے دنیوی زندگی دینی بنتی چلی جائے گی۔

لہذا دین اور دنیا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہر عمل بیک وقت دینی بھی ہوتا ہے اور دنیوی بھی۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ اگر کسی عمل میں حیوانی رُخ یعنی فقدانِ تسخیر، انفرادیت پسندی اور عدم ذوق جمال غالب ہے تو اُسے اصطلاحاً دنیوی عمل تصور کیا جاتا ہے۔ اور اگر انسانی رُخ یعنی تسخیر فطرت،

خیر کئی اور ذوقِ جمال کی طرف میلان قومی پایا جاتا ہے تو اُس سے دین کہہ دیتے ہیں۔

دین اور دنیا کی تقسیم پر زیادہ زور مذہبی تقلیدی نظام اپنی بقا، اور فوقیت کو قائم رکھنے کی وجہ سے دیتا ہے، کیوں کہ اس تقسیم سے اُس کے وجود کی ضرورت اور اہمیت کی ضمانت ملتی ہے۔ اس میں تمام صحت مند اور تعمیری معاشرتی اعمال کو، جیسے راستوں اور نپوں، پارکوں اور باغوں کی تعمیر، زراعت اور صنعت کو ترقی دینا، حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کرنا، گھروں اور بازاروں کی صفائی و پاکیزگی پر زور دینا، بیماری، بے روزگاری اور جہالت کے خلاف جنگ لڑنا، عوام کے رہائشی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اجتماعی پیمانے پر مکانوں کی تعمیر، راستوں کو روشن رکھنے کا بندوبست کرنا، ریلوں، بندرگاہوں اور طیران گاہوں کی تعمیر کرنا اور ترقی دینا، لباس اور رہائش گاہوں کی زیبائش و طہارت کا اہتمام کرنا، سائنس کی تعلیم کے لئے درس گاہوں اور محلوں کی تعمیر و استواری، زمان و مکان پر تسلط حاصل کرنے کے لئے ذرائعِ مواصلات کو توسیع و ترقی دینا، فضا کی تسخیر اور دوسرے سیاروں پر انسانی تمکن کو قائم کرنے کی کوشش کرنا اور پس ماندہ اقوام، عوام کی معاشی، ثقافتی اور علمی حیثیت کو سر بلند کرنے کی سعی و جہد کرنا اور اسی طرح کے زندگی کو نکھارنے، حسین تر بنانے اور ارتقار پذیر کرنے والے دیگر عمرانی اعمال کو بجالانا دنیوی اعمال قرار دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ انہیں عمرانی اعمال کو دیا ننداری سے بجالانے پر فرد کی نفسیات میں صالح تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو اُس کی نجاتِ اخروی کی ضمانت بنتی ہیں۔

اس طرح زندگی میں حُسن، خوش حالی و فائزِ البالی، نکھار اور ارتقار پیدا کرنے والے تمام معاشرتی اعمال کو دنیوی قرار دے دینے سے نیکی کا تصور بُری طرح مسخ ہو چکا ہے۔ کیوں کہ نیکی ان عمرانی اعمال سے ماورا اور علیحدہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ نیکی کی قدر زندگی کے عمرانی کار و پود سے شدید تعلق رکھتی ہے۔ صحت مند اور تعمیری اعمال ہی دراصل نیک یا صالح اعمال ہیں۔

نیکی کے تصور کو گداگروں کو خیرات دینے، کسی عبادت گاہ کی تعمیر کروانے یا راستہ میں کنواں کھودنے کیڑوں مکوڑوں اور مچھلیوں کو چاول یا آٹا ڈالنے اور عبادت کے ارکان کو بجالانے تک محدود کر دینے سے عظیم نقصان یہ پہنچا ہے کہ حیاتِ انسانی کا سارا معاشی، سیاسی، تہذیبی اور فکری و علمی کاروبار ایک فرد کی نظر میں نیکی سے بعید اور غیر دینی قرار پا چکا ہے۔ زندگی کو مٹر کی اور ترقی پذیر بنانے

کی سعی و جہد مسلسل عبادت نہیں رہی بلکہ عبادت محض چند ارکان کے بجالانے کا نام رہ گیا ہے۔

یہ تقلیدی نظام افراد کو بتاتا ہے کہ حیاتِ انسانی کی یہ ساری عمرانی و فکری جدوجہد ایک ذلیل و نیوی عمل ہے جس سے جلد چٹھسکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حالانکہ حیاتِ انسانی اپنے آپ کو آزاد، مقدس اور لافانی بنانے کے لئے اس جدوجہد کو اپناتی اور اسے بجاتی ہے۔

قرآن حکیم حیاتِ دنیا کا جب ذکر کرتا ہے تو اس سے مراد حیاتِ انسانی کا بہیمانہ پہلو ہوتا ہے۔ یعنی فقدانِ تخیل، انفرادیت پسندی اور عدم ذوقِ جمال۔ نہ کہ خود زندگی اور اُس کا عمرانی و فکری کاروبار، کیوں کہ ذاتِ باری تعالیٰ خود حیات کا مصدر و منبع ہے، جس نے انسانی مرحلہ میں انفرادی اجتماعی شکل میں اپنے آپ کو منظم کر لیا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو کثرتِ عبادت و اذکار سے نفسِ انسانی میں جو تزکیہ و انجلا پیدا ہوتا ہے اور اس سے فرد کی نفسیات میں جو صالح تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، اُن کے دو پہلو ہیں۔ ایک عمرانی اور دوسرا روحانی۔ کثرتِ عبادت اور متصوفانہ اشغال سے فزکی شدہ فرد اگر حق تعالیٰ کی طرف ارتقا کرتا ہے تو ساتھ ہی عمرانی لحاظ سے وہ بے حد مفید اور تعمیری اعمال بجالانے کی صلاحیت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ عبادت و متصوفانہ اشغال کا حیات کے معاشرتی اور دنیوی پہلو کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، یہ اعمال محض روحانی اور دینی ہیں، شدید غلط فہمی میں مبتلا ہونا ہے۔ فحش و منکر بیک وقت دینی اقدار بھی ہیں اور دنیوی بھی، جو اپنے مضمرات کا ان دونوں دائروں میں اظہار کرتے ہیں۔ جو فرد حق تعالیٰ کی طرف نفسیاتی طور سے ارتقا پذیر ہوتا ہے وہ ساتھ ہی دنیوی زندگی کے آداب بجالانے میں دیانت و امانت کا حامل بھی ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے فکھ اور نبی اکرم مسلم کے عمل کا موضوع انسان اور اُس کی مقدس معاشرتی جدوجہد کے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرنے، اُس کے غلط سمت میں جانے کے امکانات کی نشان دہی کرنے اور اُس کی رفتار کو تیز تر کرنے میں مدد دینا تھا۔ جسے انسان نے روزِ اول سے فطرت، معاشرہ اور خود اپنے نفس کے میکانیکی قوانین کی جبریت سے آزاد ہونے کے لئے شروع کر رکھا ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ یہ جدوجہد عمرانی اور فکری میدانوں میں ہی جاری رہ سکتی ہے۔ اس کے لئے دینی اور دنیوی کی تقسیم قطعاً غلط اور گمراہ کن ہوگی۔

(مستسل)